Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بڑا طوفان آیا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"بڑا سخت طوفان آیا ہے۔ ای نڈ کیسی ہے؟"

"ای نڈ تین روز سے بیمار ہے۔ تم سے سخت ناراض ہے تم اُسے دیکھنے نہیں آئے۔ سو رہی ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میں نے کئی بار ارادہ کیا مگر — میری اپنی طبیعت بڑی خراب رہی ہے۔"

"اوہ، اچھا؟ بڑا رنج ہوا سن کر۔ مگر ایسے سمندروں میں بھلا کون اللہ کا بندہ تندرست رہ سکتا ہے۔"

"درست ہے۔"

کچھ دیر تک ہم دروازے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں تنگ آ کر اس کے قریب کھسک گیا۔

"تمہارا کیبن —" میں نے اس کے کندھے کے اُوپر سے اندر دیکھتے ہوئے کہا، "میرے کیبن سے بڑا ہے۔"

"میرا خیال ہے سبھی کیبن ایک سائز کے ہیں۔"

"مگر یہ اور نقشے کا ہے صریحاً — دیکھو نے۔"

"ڈاکٹر نے ای نڈ کو آرام کرنے کی تنبیہ کی ہے۔" اُس نے بڑے اخلاق بڑی مضبوطی سے کہا، "میں نہیں چاہتی کہ وہ جاگ جائے۔ خدا حافظ مسٹر فیروز۔"

"خدا حافظ —" میں نے بند دروازے سے کہا۔

اپنے کیبن کو لوٹتے ہی میں نے سیدھا دیورٹ ہول، کا رُخ کیا، ڈھکنے کو کھولا، ایک بتیس فٹ اُونچی سیاہ، مہیب لہر کو حملہ آور ہوتے ہوئے دیکھ کر جبلی طور پر پیچھے ہٹا، پھر مکا ہوا میں لہرا کر اُس پر گر جا: "ترٹپو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس روز کہ رات کو طوفان تھما ہے میں بارہ گھنٹے تک سویا رہا ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ کس وقت سویرا ہوئی اور گزر بھی گئی، گو پورٹر نے بعد میں مجھے بتایا کہ دو بار جب وہ جگانے کے لیے آیا تو میں نے اس قدر درشت اور چوکنے لہجے میں اسے دفع ہو جانے کے لیے کہا کہ اسے خیال ہوا کہ میں اپنے پورے ہوش و حواس میں بیٹھا کسی سخت خفیہ سرگرمی میں مصروف ہوں۔ اس کو شاید آج تک یہ یقین نہیں آیا ہوگا کہ مجھے اس ساری بات کی کوئی خبر نہیں۔

دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے جب میں سو کر اٹھا تو ہشاش بشاش تھا۔ سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ 'پورٹ ہول' کے آہنی ڈھکنے کو کھول کر دیکھنے کا تھا۔ باہر سمندر کی شوخ نیلے رنگ کی ننھی ننھی ہموار لہروں والی سطح سپاٹ تھی اور اس پر دوپہر کی چمک دار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے، بڑی احتیاط کے ساتھ شیو کیا، ملحقہ غسل خانے میں جا کر نہایا، صاف کپڑے پہنے اور کھانے کے لیے چل دیا۔ کوریڈوروں میں، ڈیک لینڈنگ پر، سیڑھیوں پر اور ڈائننگ ہال میں رنگ و بو اور آواز و قہقہہ کا ایک طوفان تھا جس نے یوں لگتا تھا کہ سمندر کے طوفان کی جگہ لے لی ہے۔ سمندری بیماری سے اُٹھے ہوئے زرد زرد چہرے گویا گزشتہ رات کے یخ بستہ پھول تھے جن کا سارا کہرہ صبح کی دھوپ نے اُڑا دیا تھا اور جواب نکھرے نہائے اپنی ساری نزاکت اور رعنائی کے ساتھ کھڑے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں لوگ کھانا ختم کر کے باہر کی طرف لپک رہے تھے۔ بڈھا جوان عورت مرد۔ باہر باہر باہر۔

ایک دنیا تھی جو عرشہ جہاز پر اُمڈ پڑی تھی۔ ایک ہجوم تھا، ایک غلغلہ تھا، ایک شاہ گلاب کا پھول تھا جو ایک روز پیشتر نظر میں نہ جچتا تھا مگر رات کی رات میں جس نے کھل کر صبح سویرے دیکھنے والے کو اپنے اچانک اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شدید ظہور سے اور اپنے غیر متوقع پھیلاؤ سے اور اپنے بولتے ہوئے چمچماتے ہوئے رنگ و بُو سے حیرت زدہ کر دیا تھا، ایک رنگین پھلجھڑی تھی جس نے دھماکے کے ساتھ پھٹ کر چاروں طرف دور دور تک رنگ ہی رنگ بکھیر دیے تھے، اور رنگ! اور رنگ!! گہرا نیلا سمندر اور شوخ نیلا آسمان اور سفید مستول، اور سرخ سکرٹ اور زرد پُل اوور اور سبز کوٹ اور قرمزی ٹوپیاں اور سیاہ جرابیں اور دودھیا جلد اور سنہرے بال اور نارنجی بال اور براؤن بال اور شہد کے رنگ کی آنکھیں اور گہرے گہرے شوخ چمکدار چندھیا دینے والے رنگ ہی رنگ تھے جن کی ایک چیخ و پکار تھی جس میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور آنکھ ایک جگہ پہ، کسی جگہ پہ نہ رکتی تھی اور دل خوشی سے اور آزادی سے اور حسن کے احساس سے پھیلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس طوفان کے درمیان کھڑے کھڑے میں نے نظر اٹھائی اور ٹھٹک کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سامنے سے، ہمارے جہاز کے برابر سے ایک دوسرا جہاز گزر رہا تھا۔ بڑے سے جگمگاتے ہوئے راج ہنس کی طرح سفید براق جہاز، لمبا، نیچا، بانکا جہاز نیلے اور سبز پانی پہ بڑی علیحدگی، بڑی آہستگی اور بڑے وقار کے ساتھ گردن اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی پانی ہی پانی تھا اور جہاں پانی ختم ہوتا تھا وہاں سے آسمان شروع ہوتا تھا اور پھر جہاں تک نظر جاتی تھی آسمان ہی آسمان تھا اور اس سارے وسیع پُرسکوت روشن اور بیکراں خلاء کے درمیان اس اکلوتے تنہا سنگِ مرمر کے محل پہ دھوپ چمک رہی تھی۔ ان آنکھوں نے دنیا کے حسین ترین قدرتی اور مصنوعی مناظر دیکھے ہیں، مگر یہ منظر حیران کن تھا۔ اس کے شدید حسن نے مجھے عجیب طور پہ بے چین کر دیا۔ اس بے چینی سے میں مانوس تھا۔

کئی لمحوں تک مسافر ڈیک پہ دم بخود کھڑے گزرتے ہوئے جہاز کو دیکھتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے۔ پھر اچانک ایک غلغلہ بلند ہوا اور وہ دوسرے جہاز والوں کے جواب میں زور زور سے بازو ہلانے لگے۔

اب ہم پُرسکون آئرش سمندروں میں تھے۔ ڈیک پر چلتے ہوئے میں نے بگلوں کو گنا۔ وہ تعداد میں چھبیس تھے اور شاید سو رہے تھے۔

"ہلو ــــ"

"ہلو ــــ"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔ تم کیسے ہو۔"

"شکریہ۔ ای نڈ نظر نہیں آ رہی۔"

"صبح پہلی بار نکلی تھی۔ اب آرام کر رہی ہے۔ ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی۔"

"افسوس ہے میں اُسے مل نہ سکا۔ دراصل آج میں دوپہر تک سویا رہا۔"

"اچھا ؟" وہ ہنسی۔

"میڈم سی گل۔"

"ہوں۔"

"تم نے یہ منظر دیکھا ؟"

"کون سا منظر ؟"

"یہ جہاز۔"

"ہاں۔ بڑا دلکش منظر تھا۔"

"میڈم سی گل۔"

"کہو۔"

"کچھ نہیں۔" میں ہنسا، "بڑا دلکش منظر تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لبگلا اُڑ کر ٹولی سے پرے جا بیٹھا۔ دور پرلے سرے پر اَینا نے ڈیک کو پار کیا۔

"تم بہت اچھا بُن لیتی ہو۔" میں نے کہا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔

"میڈم سی گل۔"

"کہو۔"

"کچھ نہیں۔" میں ہنسا، "تم واقعی بڑا عمدہ بُنتی ہو۔"

"میں نے ٹننگ باقاعدہ سکول میں سیکھی ہے۔"

"کینیڈا میں؟"

"نہیں جرمنی میں۔" اس نے کہا، "بہت پہلے کی بات ہے۔"

"جرمنی میں تمہارا گھر کہاں ہے۔"

"ہیمبرگ کے قریب ہمارا گاؤں ہے۔"

"وہاں تمہارے گھر والے رہتے ہیں؟"

"وہاں میری ماں رہتی ہے۔"

"میڈم سی گل۔"

"ہاں۔"

"ای نڈ تو انگریزی نام ہے۔"

اُس نے سنی ان سُنی کر دی۔

"میڈم سی گل۔"

"ہوں۔"

"تم رقص پر کیوں نہیں آتیں۔"

اُس کا چہرا گلابی ہو گیا۔ "مجھے پسند نہیں۔" اس نے کہا۔

دور پرلے سرے پر اَینا اُوپر کے ڈیک کی سیڑھیاں اُترتی اور غائب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس کے بعد میرے متلاشی مجھے جہاز کے کونے کونے میں لیے پھرے۔ کسی جگہ پر بیٹھ کر میں نے سہ پہر کی چائے پی، کسی شخص سے کوئی بات کی؛ کہاں پر، کس سے، یہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہا۔ دراصل اس شام کی کوئی بات مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہی سوائے اس وقت کے جس وقت کہ میں "ٹیورن" میں داخل ہوا ہوں۔

"ٹیورن"، بار سے ملحق چھوٹا سا نیم روشن حجرہ تھا جس کی تاریک دیواروں کے ساتھ ساتھ لوہے کی میز کرسیاں اور صوفے پڑے تھے، جس میں صرف تین سازندے بیٹھتے تھے جو صرف "جاز" کی تُند اور اُداس دُھنیں بجاتے تھے؛ جہاں پر لوگ آدھی رات کے بعد سے آنے شروع ہوتے تھے اور صبح تین چار بجے تک ایک دوسرے سے بہت چمٹ کر ناچتے رہتے تھے اور صرف شراب پیتے تھے۔ ڈنر کے بعد جب میں بڑے بال روم میں ناچنے والوں کی بھیڑ میں سے بمشکل گزر کر "ٹیورن" میں داخل ہوا ہوں تو وہ وقت مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کیونکہ اس وقت کونے کے ایک صوفے پر ایک لڑکا بیٹھا اَینا کو بے تحاشا چوم رہا تھا اور وہ خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے آنکھیں جھپکا کر چاروں طرف دیکھا اور دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

جب میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ "ٹیورن" تقریباً خالی تھی۔ صرف ایک طرف کو دو بڈھے بیٹھے شراب پی رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس کونے میں دیکھا۔ اَینا کا گلاس بھرا ہوا اُس کے سامنے رکھا تھا۔ لڑکے کا گلاس خالی تھا اور وہ مکمل طور پہ مدہوش نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کو میں نے پہلے روز پاگلوں کی طرح ناچتے ہوئے اور دوسرے دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اَینا کے دفتر میں اُس سے باتیں کرتے ہوئے پایا تھا۔ اب وہ سوئی سوئی آنکھوں سے میز کو تک رہا تھا اور اس کا ایک بازو اَینا کے گلے میں پڑا تھا۔ پھر وہ مڑا اور دوبارہ پاگلوں کی طرح اَینا کو منہ پہ گالوں پہ ٹھوڑی پر ماتھے پر اور بالوں پہ چومنے لگا۔ چومتے چومتے اس نے دونوں بازو اَینا کے گلے میں ڈال کر اُسے بھینچ لیا۔ جب تھوڑی سی کش مکش کے بعد اَینا نے اُسے بڑی آہستگی اور (میں نے حیرانگی سے دیکھا) بڑی بے حسی کے ساتھ اپنے سے جدا کیا تو وہ اُس کی گود میں سر رکھ کر بظاہر سو گیا۔ اَینا نے گھبرا کر دو ایک بار مجھے دیکھا اور آنکھیں چرا لیں۔ لڑکے نے وہیں پڑے پڑے چند ایک سسکیاں لیں۔ پھر وہ اُٹھا اور دوبارہ اُسے چومنے لگا۔

بیس منٹ تک اسی طور تماشا کرنے کے بعد اچانک وہ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اَینا دونوں ہاتھ گود میں رکھے بے حس نگاہوں سے شراب کے گلاس کو گھورتی رہی۔ ایک بے وجہ، بے موقعہ اور لاحاصل غصہ دھوئیں کی طرح آہستہ آہستہ میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔ میں تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اُس کے اُوپر جا کر کھڑا ہوا۔ پھر میں نے اس پر جھک کر ایک مختصر سا قہقہہ لگایا۔

"مس ہیمبرگر۔" میں رقص کی درخواست کے روایتی انداز میں جھکا۔

مگر یہ درخواست محض تمسخر تھا۔ کیونکہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا اور تقریباً کھینچتا ہوا اسے کمرے کے وسط میں لے آیا۔

کچھ دیر تک وہ اُسی بے حسی سے ناچتی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ پہ قابو پا لیا۔ تب اس نے چونک کر اپنے آپ کو مجھ سے جدا کر لیا۔ ہم رقص کرتے رہے۔

"تم بڑا بنتی ہو۔" میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ لکڑی کی مانند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکڑ گئی۔

"وہ کون تھا۔" میں نے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کھینچا، وہ اکڑی رہی۔

"وہ کون تھا؟" میں نے کہا۔

ہماری خاموش جنگ جاری رہی۔ ٹرمپٹ بجانے والے سازندے کے گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

"نہیں نہیں۔" آخر اس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"میں اس طرح نہیں ناچوں گی۔"

"اچھا۔" میں ہنسا، "ٹھیک ہے۔"

"ہال میں چلو۔"

"نہیں یہاں۔"

"کبھی نہیں۔" اُس نے قطعی لہجے میں کہا، "ہال میں۔"

ہم ہال میں آکر رقص کرنے لگے۔ یہاں پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تین روز کی مسلسل بیکاری کے بعد آج ناچنے والے عروج پر تھے۔ کئی لوگوں نے آکر اَنیا کو مجھ سے چھیننا چاہا مگر میں نے بداخلاقی سے انہیں نظر انداز کر دیا۔ پہلی دھن ختم ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ پھر دوسری دھن۔ تالیاں۔ پھر تیسری۔ پھر چوتھی۔ ہم مسلسل رقص کرتے رہے۔ ہماری خاموش جنگ جاری رہی۔

آخر اس نے عاجز آکر میری طرف دیکھا۔ "اس سے کیا فایدہ آخر۔!" اس نے کہا۔

رقص جاری رہا۔

"میں سب جانتا ہوں۔" میں نے کہا، "کیا فرق پڑتا ہے آخر۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ اب سازندوں نے ایک جرمن نغمے "برلین کی گلیوں میں" کی دھن بجانی شروع کر دی تھی اور سارے جرمن جوڑے جذبات سے مست ہو کر بلند آواز میں ساتھ ساتھ گانے کے بول دہرا رہے تھے۔ میں نے اَینا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی جھلک دیکھی جس نے ایک لحظے کے لیے مجھے پریشان کر دیا۔ وہ ابھی تک خاموش تھی۔ گاتے ہوئے جرمنوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اَینا نے گانے کے لیے منہ کھولا، اس کے ہونٹ ہلے، پھر وہ دفعتاً ڈھیلی پڑ گئی اور بے جان شئے کی طرح میری طرف کھچی آئی۔ اس کے قدم رُک گئے اور ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ میں نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے اوپر کھینچا۔ اُس نے دو بار آہستہ آہستہ میرے سینے پر سر مارا، پھر اُسے وہیں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گانے کے شور میں کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ میں اُسے چپ کرانے کی اوٹ پٹانگ کوششیں کرتا ہوا بمشکل تمام ہال میں سے نکال کر بار پر لے آیا۔ اس نے اپنا گال بار کاؤنٹر کے سنگِ مرمر پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ بار مین نے دو ایک بار اُسے بلایا، پھر جرمن زبان میں کوئی بات کی جس کا بڑی دیر کے بعد اَینا نے کوئی جواب دیا۔ بار مین نے جلدی سے گلاس میں وہسکی ڈال کر بڑھائی اور اس کے بالوں کو تھپتھپایا۔ وہسکی کا گلاس چند سانسوں میں خالی کرنے بعد اُس نے آنسو خشک کیے اور بولی :

"مجھے باہر لے چلو۔"

ڈیک تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ندامت سے، پریشانی سے، رک رک کر میں نے کئی بار معذرت کی۔ آخر وہ اُداسی سے مسکرائی اور ریلنگ پر جھک کر سمندر کے عمیق اندھیرے میں دیکھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر کے بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز گہری اور حیرت انگیز تھی۔

"مسٹر فیروز۔" اس نے کہا، "تمہیں پتا ہے میں نے کیا کیا دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

اس نے شاید نہیں سُنا، کیونکہ وہ بولے گئی، "تم کو پتا ہے میں نے کیا کیا دیکھا ہے؟ ایک زمانے میں میں ایئر ہوسٹس تھی۔ میں نے بیس ہزار فٹ کی بلندی سے طلوعِ سحر کا منظر دیکھا ہے۔" وہ رکی، "اور میں نے پُرسکون سمندروں پر غروبِ آفتاب دیکھا ہے۔ اور پیرس میں مسلسل دس گھنٹے تک میں مونالزا پر نظریں جمائے کھڑی رہی ہوں، حتیٰ کہ وہ میری آنکھوں میں اُتر آئی ہے۔ اس کے بعد — تم سمجھتے ہو کہ اس کے بعد انسان کے دل میں کسی جذبے کی خواہش رہ جاتی ہے؟"

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ لڑکا مجھ سے عمر میں بارہ سال چھوٹا ہے اور اپنے گھر جا رہا ہے۔ جانتے ہو کہاں؟" وہ عجیب طریقے پر ہنسی، "کہیں بھی نہیں۔"

"کہیں بھی نہیں؟"

"وہ مشرقی جرمنی سے بھاگ کر آیا ہے اور اب وہاں نہیں جا سکتا مگر جانا چاہتا ہے اور جائے گا چاہے رستے میں مارا جائے چاہے پکڑا جائے مگر رات کے اندھیرے میں وہ سرحد کو پار کرے گا۔ کیونکہ وہاں اس کی ماں رہتی ہے اور ساری دنیا میں وہی اس کا گھر ہے۔ تم بھی کبھی جوان رہے ہو گے مسٹر فیروز، اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر سوچو۔ وہ بمشکل اٹھارہ برس کا ہوا ہے۔"

میں نے حلق میں سخت بدمزگی محسوس کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور مشرقی جرمنی میں میرے باپ کا گھر تھا۔" وہ پھر بولی، "سامنے کی سیڑھیوں پر جب دھوپ پڑتی تھی تو میں وہاں بیٹھ کر اپنی بلّی سے کھیلا کرتی تھی اور کھانے کے وقت پر میری ماں اندر سے آوازیں دیا کرتی تھی اور بیک یارڈ میں میرا باپ بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا۔ اسی بیک یارڈ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے میرا لڑکپن گزرا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب شام پڑا کرتی تھی — مسٹر فیرو زندگی میں سب کچھ دیکھ لینے کے بعد انسان کو صرف اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے اور وہ جگہیں — گرمیوں کے دنوں میں جب شام پڑتی تھی۔" وہ رک گئی۔ پھر اُس نے آہستہ سے میرے بازو کو چھوا۔ "وہ دیکھو ہماری ننھی دوست۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہم سے کچھ دور ای نڈ ڈیک پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ کرسی پر اس کی ماں بیٹھی پُل اوور بن رہی تھی۔

"یہ وہ نسل ہے جو بے گھر ہو چکی ہے۔" اس نے کہا۔

"مگر۔" میں نے تھوک نگلا۔ "ہیمبرگ کے قریب —"

"اس کا گاؤں ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی، "ہوگا — جانتے ہو یہ کیا کرتی ہے؟"

"نہیں۔"

"سٹرپ ٹیز۔"

"ایں؟" میرا منہ کھل گیا۔

"ہاں۔ اور اس بچی کا باپ اس سے شادی کیے بغیر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" اُس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اس کا گھر کہاں ہے؟"

اس وقت میں نے پہچانا۔ یہ وہی جگہ تھی، جہاں پر ہم کھڑے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی۔ میں نے سہم کر اندھیرے میں دیکھا۔ سمندر کی تاریک چھاتی اُٹھ رہی تھی اور بیٹھ رہی تھی، اُٹھ رہی تھی اور بیٹھ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر وہ آخری بار مجھ سے مخاطب ہوا:

"یہ وہ بہادر نسل ہے جس نے سب کچھ کھویا ہے مگر اپنا ذہن محفوظ رکھا ہے۔" اس نے کہا، "اور انسانی ذہانت حساب کتاب کا نہیں، انسانی ذہانت دوسرے کے دکھ کو پہچاننے اور ہاتھ بڑھا کر اس میں شریک ہونے کا نام ہے۔ اس لیے کہ تم محض شریک ہو سکتے ہو یا نہیں سکتے چاہے وہ دکھ ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ ہر وہ سانس جو تم لیتے ہو تم ضائع کرتے ہو، اس وقت بھی جب وہ ابھی تمہارے اندر ہوتا ہے اور زندہ و سلامت و محرک ہوتا ہے وہ ضائع ہو چکا ہوتا ہے پہلے ہی، اس لیے کہ چیزوں کی دنیا میں ساری چیزوں کی نوعیت انسانوں کے واسطے سے اس طور واقع ہوئی ہے کہ وہ پائی نہیں جا سکتیں، کہ جب پائی جاتی ہیں تو ضائع ہو جاتی ہیں اور یہی چیزوں کا اسرار ہے کہ جب آدمی پاتا ہے اور کھوتا ہے اور بضد رہتا ہے اور پاتا ہے اور کھوتا ہے تو پھر خود چیزوں میں شامل ہو جاتا ہے اور چیز چیز کو نہ چھو سکتی ہے نہ پا سکتی ہے نہ رسائی حاصل کر سکتی ہے کہ یہی چیزوں کی کمتری ہے۔ کہ ہر وہ سانس جو تم لیتے ہو، اس وقت بھی جب وہ ابھی تمہارے اندر محفوظ و مستور ہوتا ہے کھو چکا ہوتا ہے اس لیے کہ کھینچا جا چکا ہوتا ہے اور پھر نہ تھم سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے؛ صرف ہاتھ سے جا سکتا ہے اور چلا جاتا ہے؛ اس لیے کہ جب ایک بار تم چیزوں پر قابض ہو جاتے ہو تو پھر اور کچھ نہیں کر سکتے صرف ان کو ضائع کر سکتے ہو۔ یہ ملکیت کا قانون ہے۔

"کہ اولیں معصومیت کے کھو جانے کے بعد انسانی ذہانت کی سعادت صرف ان کے نصیب ہوتی ہے جو دنیا کے حسن کو دیکھ کر وصال کی نہیں توصیف کی سعی کرتے ہیں کہ یہی ایک راستہ اس میں شامل ہونے کا ہے۔ باقی سب تنہائی ہے۔"

میری پرانی رفیق، بدمزگی، حلق سے نکل کر سارے بدن پر پھیلتی جا رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اَینا پتا نہیں کب کی جا چکی تھی۔ میں بھاری قدموں سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہلو ای نڈ۔" میں نے کہا۔

"ہم آپ سے نہیں بولتے۔"

"کیوں۔"

"تم اتنے دن مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آئے۔"

"میں آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔"

"ممی ممی۔ مِس ٹَرفے روز آئے تھے؟"

"ہاں۔" میڈم سی گل نے کہا، "میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔"

"کب بتایا تھا؟"

"تم بھول گئی ہو۔ میں نے بتایا تھا۔"

"اچھا۔" وہ خوش ہو گئی۔ "مِس ٹَرفے روز، اب ہم آپ سے بولنے لگتے ہیں۔"

"ای نڈ۔"

"ہوں۔"

"آج بگلے چھبیس تھے۔"

"اچھا؟"

وہ اپنی گڑیا سے کھیلتی رہی۔

"ای نڈ۔"

"ہوں۔"

"آؤ۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا، "باتیں کریں۔"

"اچھا۔" اُس نے کہا اور خاموشی سے کھیلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر اپنی ماں کے پاس بھاگ گئی جو اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ماں بیٹی نے 'شب بخیر' کہا اور نیچے چلی گئیں۔ سامنے سمندر سرد اور تاریک اور پُرسکون تھا۔ کوئی آواز بھی نہ تھی۔ اندر رقص ہو رہا تھا، سازندے ساز بجا رہے تھے، باہر لوگ قہقہے لگا رہے تھے، نیچے جہاز کا انجن چل رہا تھا، ہر طرف بڑی خاموشی تھی۔

'چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہم انگلستان کے ساحل پر ہوں گے۔'

خاموشی کو کم کرنے کی خاطر میں نے سوچا، پھر جمائی لے کر اپنے کیبن کو لوٹ آیا۔

+++

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھوپ

(افسانہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نالے کا پُل بہت اونچائی پہ تھا، چڑھتے چڑھتے اس کا دم پھول گیا۔ پُل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہ شہر کی آخری حد تھی۔ یہاں سے اب کھیت اور کھلی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ اس نے ستانے کے انداز میں کمر پہ ہاتھ رکھے اور آنکھیں سیکیڑ کر دور دور تک دوپہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ بہار کے موسم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"یہ پھاگن ہے۔" اس نے خوشی سے سوچا، اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بھلا پھاگن کی، کون سے تاریخ تھی!

تھوڑی دیر کے بعد ہار کر اس نے سوچا — "بیس برس گزر گئے!" اور عمر کے گزرنے کو زبان کے نیچے سے اُبل کر نکلتے ہوئے لعاب میں محسوس کیا۔

پھر اس نے ماتھے پر سایہ کرتے ہوئے نیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور پلٹ کر نظر ڈالی۔ پُل پر چڑھتی ہوئی سڑک پر اب اس کا سات سالہ بچہ چلا آ رہا تھا۔ چڑھائی کافی تھی اور بچہ ایک گول اور چکنے سلیٹی رنگ کے پتھر سے فٹ بال کھیلتا ہوا دم لے لے کر چڑھ رہا تھا۔ پیچھے شہر تھا۔ شہر کے پیچھے سورج تھا۔ وسط میں اکبر بادشاہ کا قلعہ تھا جو سب سے اونچا (اور اندر سے ویران) تھا۔ جس کے دونوں جانب ایک کے ساتھ ایک بنے ہوئے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں کی ٹوٹی پھوٹی سیاہ لکیر ایک خاص زاویے پر ڈھلتی تھی یوں کہ دور سے شہر چمک دار آسمان کے مقابل ایک بہت بھاری اور سیاہ حجم والی اور بہت پھیلے ہوئے دامن والی مخروطی پہاڑی کی طرح لگتا تھا جو جیتی جاگتی ہو۔ اس کے اوپر کہیں کہیں بہار کی چھوٹی چھوٹی بدلیاں تھیں — دھنکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی اور پریس کی ہوئی روٹی کی کٹی پھٹی، نوکیلی، گول اور گھنی، تلملا کر، اُبل کر نکلتی ہوئی نندا اور ٹھوس اور بھاری اور جامد چٹانیں — بہار کی بدلیوں کی اس مخصوص شکل سے وہ بچپن سے مانوس تھا۔ اس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس مہینے کے آسمان کے لش لش کرتے ہوئے زردی مایل نیلے رنگ سے بھی وہ ایک عمر سے واقف تھا جہاں نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اور گو آج صبح بیس سال کے بعد وہ اپنے شہر کو لوٹا تھا مگر اس وقت پُل پہ قدم رکھتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موسمِ بہار میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اب اس کا بیٹا اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور باپ کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے، سورج کے مقابل آنکھیں سکیڑے شہر کو دیکھ رہا تھا۔

"دم لے لو۔" اس نے بیٹے سے کہا۔

بچہ اسی گول کنکر سے فٹ بال کھیلتا ہوا پُل کے دوسرے سرے پر جا کھڑا ہوا اور سورج کی طرف پشت کر کے پُل سے اُترتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگا۔

"بابا —" دفعتاً وہ مڑ کر چلایا۔

اس نے سر سے ہیٹ اُتار کر اُنگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر کوٹ کا کالر، جسے چڑھائے چڑھائے وہ شہر سے نکلا تھا، نیچے کیا اور جا کر اپنے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بابا!" بچے نے کہا، "زمین گول ہے نا؟"

"ہاں۔" اس نے کہا، اور پُل سے ڈھلتی ہوئی سڑک پر نظر ڈال کر مسکرایا۔ "ہر چیز گول ہے بیٹے!"

"ہر چیز؟"

وہ بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھے پُل سے اُترنے لگا۔ اب دونوں باپ بیٹے کی پشت سورج کی طرف تھی اور ان کے سایے آگے آگے سڑک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے لپٹے ہوئے چل رہے تھے۔ "چلو!" پھر اچانک اس نے نعرہ لگایا۔ "چلو!" اور بیٹے کو کندھے پر ٹھونک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بچہ آواز نکالے بغیر ہنسا اور باپ کے پیچھے پیچھے ڈھلان پر بھاگنے لگا۔ یہاں پر سڑک تقریباً سنسان تھی۔ صرف دور آگے ایک تانگہ دیہاتی سواریوں سے لدا ہوا جا رہا تھا۔ پہلے پہر کی ہوا ابھی تھمی نہ تھی اور جاڑوں کے گرے ہوئے پتے سڑک کے کنارے کنارے اُڑے جا رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس نے مکڑی کے ایک تار کو عین اپنی آنکھوں کے برابر دیکھا اور ہوا میں غوطہ لگا کر نکل گیا۔ جب ڈھلان ختم ہو گئی اور زمین ہموار آگئی تو وہ رک گیا۔ بچہ دوڑ کی تیزی میں اس سے آ کر ٹکرایا اور اس کے بازو کے ساتھ جھول گیا۔ چند منٹ تک دونوں خاموش کھڑے ہنستے اور سانس برابر کرتے رہے۔ پھر اس نے بیٹے کے کندھوں کو اپنے بازوؤں کے گھیر میں لے لیا اور سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں قدم دھرا۔

"اُسترے کی دھار کبھی دیکھی ہے بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیسی ہوتی ہے بھلا؟"

"بڑی تیز ہوتی ہے۔"

"وہ بھی گول ہوتی ہے۔"

"گول ہوتی ہے؟"

"اگر اسے بہت بڑی خوردبین میں سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اصل میں گول ہے۔"

"بہوت بڑی خوردبین میں سے؟"

وہ لفظوں کے غلط استعمال پہ دل ہی دل میں ایک ساتھ جھنجھلایا اور محظوظ ہوا، "میرا مطلب ہے کہ بہت طاقت ور خوردبین میں سے۔" اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔

بچہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ وہ بے یقینی سے ہنسا اور باپ کا بازو پکڑ کر جھول گیا۔

اب وہ ایک تنگ سی پگڈنڈی پر جا رہے تھے جس کے دونوں بازوؤں پر گیہوں کی فصل کھڑی تھی۔ گیہوں کی گہرے سبز رنگ کی فصل ابھی گھٹنوں گھٹنوں آئی تھی اور دور دور تک اُگی ہوئی تھی اور اس کی ہمواری اس بات کا پتا دیتی تھی کہ زمین بڑی لایق ہے اور پانی ہر بیج بوٹے ڈھیلے کو وافر اور ایک سا ملا ہے۔ زردی مایل سبز رنگ کی لمبی لمبی مونچھوں والی ان گنت نازک بدن بالیاں قطار در قطار ہوا کے رخ جھکی ہوئی تھیں اور رکوع میں گئے ہوئے عیدین کے نمازیوں کی یاد دلاتی تھیں۔

(جب بھی موسم بدلتا تھا اور سورج میں چمک پیدا ہوتی تھی اور گیہوں کی جڑوں پر زردی چڑھنے لگتی تھی یہی نیم گرم ہوائیں کہیں سے آتی تھیں اور جادو کی طرح ساری زمین پر چل جاتی تھیں ـــــ اس نے یاد کیا ـــــ اور سارے چرند پرند، پیڑ پودے، حیوان اور انسان انہی زرد رنگ ہواؤں کے طلسم میں جیسے جکڑے جاتے تھے اور لہو کا سست اُچھال اس تال یہ لہر مارتا تھا جو کہیں سنائی نہ دیتی تھی، جس کی بے آواز دھمک وہ جذبہ جگاتی تھی جو صرف بدلتے ہوئے موسم کا جذبہ ہوتا ہے اور جو نہ اُداس کرتا ہے نہ مسرور، صرف نئے سرے سے پیدا کرتا ہے ـــــ اس نے یاد کیا ـــــ اور اسی موسم میں جب وہ سات برس کا تھا اور اپنی پہلی ایئرگن کندھے پر رکھے پگڈنڈیوں پر اپنے باپ کے ساتھ شکار کی تلاش میں گھوما کرتا تھا تو اس کا باپ ہاتھ بڑھا کر ایک سٹا توڑتا تھا اور اسے اُلٹا کر کے چپکے سے اس کے پاجامے میں گھسا دیا کرتا تھا، اور پھر وہ جوں جوں اسے نکالنے کی کوشش کرتا وہ اُوپر ہی اُوپر چڑھتا جاتا اور اس کا باپ مصنوعی تشویش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لہجے میں کہتا: "کیا ہے بیٹے؟ — کیا بات ہے بیٹے؟" — اور اِدھر اُدھر سے جھانکتا رہتا مگر سٹے کے نکالنے میں اس کی کوئی مدد نہ کرتا بلکہ پیٹ ہی پیٹ میں ہنسے جاتا، ہنسے جاتا۔ پھر وہ تنگ آکر اپنی ایئرگن کو پگڈنڈی پر رکھ دیتا اور دونوں ہاتھوں سے سٹے کو نیچے کی طرف دھکیلتا اور وہ پاجامے کے اندر پھدک پھدک کر اُوپر ہی اُوپر چڑھتا جاتا یوں جیسے کوئی لمبی سی چڑیا ہو۔ اس طرح، گو بعد میں وہ بڑا ہو گیا اور اسے سٹے کے اس عمل کا اصل پتا چل گیا، مگر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کے اس حصّے میں، جو نامعلوم کی خبر رکھتا ہے اور شاید اصل سے زیادہ اصل ہوتا ہے، سٹے کا وہ روپ رہ گیا جو لمبی سی چڑیا یا گھاس کے طوطے ایسی کسی پھدکنے والی جان دار شے کا تھا۔)

اس نے ہاتھ بڑھا کر گیہوں کی ایک بالی توڑی اور اس کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں داب کر کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ اس کا بیٹا بیکر کی جیبوں میں ہاتھ دیے تنگ پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔

"تاریخ بھی گول ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیسے؟"

"کہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔"

"کیسے؟"

"ایسے —" وہ سٹے کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا، "کہ بڑی بڑی فوجیں اُٹھتی ہیں اور ملک ملک پر جھنڈے گاڑتی ہیں اور ایک ایک سپاہی فاتح بنتا ہے اور داستانوں میں نام پاتا ہے۔" اُس نے کہا، "یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مفتوح کمزور ہوتا ہے اور کمزوری میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ وہ قصّے اور قصیدے سے، اختیار کے لالچ سے اور غرور کے تحفے سے فاتح کو مار گراتا ہے۔ صرف وقت ذرا زیادہ لیتا ہے۔ ایک صرف یہی فرق پڑتا ہے اور بس، اور فاتح کو اس وقت ہوش